ابوبکر باقلانی کے تنقیدی افکار

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی ایم اے پی ایچ ڈی لیکچر شعبۂ عربی ونکٹیشورا یونیورسٹی۔ آندھرا

ابوبکر باقلانی کے تنقیدی افکار اپنی عظمت کے لحاظ سے اس قدر اہم ہیں کہ چوتھی صدی ہجری کے ناقدوں میں ان کو اچھی خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ انھوں نے ادبی تنقید۔۔ پر کوئی کتاب تصنیف نہیں کی۔ مگر اپنی کتاب "اعجاز القرآن" میں انھوں نے زبان و بیان کے رموز و نکات پر جو عالمانہ اور فنکارانہ مباحث پیش کئے ہیں ان کی مثال بہت سی خالص، تنقیدی کتابوں میں بھی ملنی مشکل ہے۔ اس عظیم ناقد نے قرآن مجید کے محاسن کا مطالعہ مختلف انداز سے کیا ہے۔ اس طرح باقلانی نے درحقیقت اعجاز القرآن میں ادبی تنقید میں تقابلی مطالعہ کے طریقہ کا رواج ڈالا ہے۔ اس خاص نقطۂ نظر سے اتنی کامیاب کوشش اس سے قبل کبھی نہیں کی گئی تھی۔ باقلانی نے عربوں کے ادبِ عالیہ سے قرآن مجید کے محاسن کا مقابلہ کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کی زبان اور اس کا اسلوبِ بیان سب سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ ان مباحث میں باقلانی کے زمانے کے تمام ادبی و تنقیدی رجحانات شامل ہو گئے ہیں جن سے کتاب کی عظمت بڑھ گئی ہے۔

علماء نے اس امر کی کوشش کی کہ قرآن مجید کے معجزہ کو اس کی زبان و حسن بیان میں تلاش کریں چنانچہ قرآن مجید کی ادبی زبان کے محاسن پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں کچھ زمانہ کے دست برد کی نذر ہوگئیں اور کچھ آج بھی ہمارے لئے تنقیدی بصیرت کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ جو کتابیں باقی رہ گئی ہیں ان میں اعجاز القرآن مصنفہ رمانی (المتوفی ۳۰۹ھ)

کتاب مشکل القرآن مصنفہ ابن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ) اعجاز القرآن از خطابی اور معانی القرآن مصنفہ فرّاء (متوفی ۲۰۷ھ) ایسی کتابیں ہیں جو تیسری صدی ہجری میں تصنیف کی گئیں۔ جس طرح شعراء کے تراجم میں کتابیں لکھی گئیں اسی طرح قرآن مجید کے محاسن و بیان پر کثرت سے کتابیں تصنیف کی گئیں اسی طرح بیک وقت ادبی تنقید ایک طرف ادب کے دامن میں اور دوسری طرف قرآن مجید کے دامن میں یکساں پروان چڑھتی رہی۔ اس نقطۂ نظر کی تفسیر کرتے ہوئے ڈاکٹر زغلول سلام نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ خالص عربی تنقید قرآن مجید سے وجود میں آئی۔ علماء نے تنقید کے عناصر طرز بیان میں قرآنی نہج سے مستنبط کئے۔ یہی وہ عربی تنقید کا مکتب فکر ہے جو یونانی اور فلسفیانہ مدرسہ کی ضد میں وجود میں آیا۔

بہر حال اس بحث میں اتنی بات یقینی ہے کہ خالص عرب ناقدوں نے یونانی اثرات کی مخالفت کی ہے۔ باقلانی نے درحقیقت دونوں مدارس فکر سے تاثر قبول کر کے قرآن مجید کے اسلوب بیان کی عظمت کو سامنے لانے کی قابل ستائش جدوجہد کی ہے۔

باقلانی نے قرآن مجید میں سجع کے وجود سے انکار کیا ہے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ قرآن مجید شعر نہیں ہے اس لئے کہ اس میں وزن نہیں پایا جاتا[۱]۔ وہ سجع سے بھی مبرا ہے اس لئے کہ سجع میں معنی اس لفظ کا پابند ہو جاتا ہے جس سے صفت سجع ظاہر ہوتی ہے[۲]۔ جس کلام میں معنی لفظ کا پابند ہوگا وہ کبھی عمدہ اور دلکش نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں الفاظ معانی کے ماتحت استعمال کئے گئے ہیں اس لئے اس میں سجع کا وجود نہیں۔

ان کا یہ نظریہ ہے کہ کلام حسن و بلاغت میں مختلف معیار کا ہوتا ہے۔ ایک معنی سے دوسرے معنی کی طرف کامیابی سے منتقل ہونا فنی مہارت چاہتا ہے اور اکثر اس مرحلہ میں کامیابی حاصل

۱؎ اعجاز القرآن تالیف ابوبکر باقلانی تحقیق احمد صقر طبع دار المعارف مصر ص ۵۸

۲؎ ایضاً ص ۸۸

نہیں ہو پاتی، مگر قرآن مجید کا معاملہ اس کے برعکس ہے اس کی زبان میں تفاوتِ کلام بالکل پایا نہیں جاتا۔ اس طرح نہایت بلاغت و کامیابی سے قرآن مجید میں انتقالِ معانی کی مثالیں موجود ہیں۔ اگر ہم شعراء کے کلام پر غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان کے کلام میں فروق و تفاوت پایا جاتا ہے۔ کسی معنی کو بڑے فنی انداز سے وہ پیش کرتے ہیں اور کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی مفہوم کو پیش کرنے میں وہ بری طرح ناکام نظر آتے ہیں۔ بعض شعراء ایسے ہیں کہ قصیدہ میں وہ ایک اعلیٰ فنکار کے لباس میں ظاہر ہوتے ہیں مگر "رجز" میں ان کا مرتبہ بہت گھٹ جاتا ہے بعض نثر..... عمدہ لکھتے ہیں مگر ان کی شاعری میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا اسی طرح بعض شاعری میں ممتاز ہوتے ہیں مگر نثر میں فنی حیثیت سے بہت گر جاتے ہیں[1]۔

مذکورہ اختلافات کی بنا پر باقلانی نے شعراء کو مندرجہ ذیل اقسام میں تقسیم کیا ہے۔

کچھ شعراء ایسے ہیں جو مدح میں ید طولیٰ رکھتے ہیں مگر ہجو میں بالکل ناکام ہیں۔ بعض ہجو میں صاحبِ امتیاز ہیں مگر مدح میں نہیں چل سکتے۔

بعض شعراء مدح میں عمدہ کلام پیش کرتے ہیں مگر مرثیہ میں عاجز ہیں۔ اسی طرح کچھ شعراء مرثیہ میں عظمت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ مگر دوسری اصنافِ سخن میں عاجز نظر آتے ہیں۔

اسی طرح بعض شعراء اونٹ اور گھوڑے کی تعریف میں مہارت کا ثبوت دیتے ہیں، بعض رات کے سفر، باغوں کی تعریف، شراب نوشی کی کیفیات، عورتوں کے متعلق جذبات اور جنگ کے بیان پر قدرت تامہ رکھتے ہیں کسی کو کسی خاص موضوع پر خاص ملکہ ہوتا ہے اور کسی کو کسی دوسرے موضوع پر امتیاز حاصل ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ مثل مشہور ہے امرؤ القیس جب گھوڑے پر سوار ہو تو عمدہ شاعر کے لباس میں جلوہ گر ہوتا ہے نابغہ جب خوف کی حالت میں ہو تو بڑا شاعر ہے زہیر

---

[1] اعجاز القرآن مؤلفہ باقلانی ص ۵۴۔ ۵۵

کو جب رغبت ہو تو وہ عظیم شاعر ہے اور اعشیٰ جب پی لے اور خوش ہو تو بڑا شاعر ہے۔ بالکل یہی کیفیت خطبات، رسائل اور کلام کی دوسری اصناف میں بھی پائی جاتی ہے[1]

باقلانی رقمطراز ہیں کہ عربوں کا عقیدہ تھا کہ "جن" بھی اشعار موزوں کرتے ہیں چنانچہ انھوں نے جنوں کے سترہ اشعار نقل کر کے یہ ثابت کیا کہ وہ بھی قرآن مجید کی ایسی زبان استعمال کرنے سے عاجز ہیں[2] تعجب اس پر ہے کہ باقلانی نے کیوں کر جنوں کی طرف منسوب اشعار کو صحیح تسلیم کر لیا ہے

ان کا نظریہ یہ ہے کہ عمدہ کلام میں جتنی خوبیاں ممکن ہو سکتی ہیں وہ سب قرآن مجید میں موجود ہیں۔ یہ اوصاف الطاف، ایجاز، جمع، تفریق، استعارہ، تصریح اور تحقیق وغیرہ جیسی خوبیوں کی شکل میں پائے جاتے ہیں[3] مطلب یہ ہوا کہ عمدہ کلام کی یہ خوبیاں ہونی چاہئیں

عمدہ کلام وہ ہے جس میں الفاظ و معانی باہم مناسبت کے ساتھ پائے جائیں الفاظ معانی سے نہ بڑھنے پائیں۔ اور معانی الفاظ سے تجاوز نہ کریں۔ ایسی شکل میں فصاحت کی جلوہ گری پوری طرح ظاہر ہوتی ہے[4]

باقلانی حسنِ کلام کا ایک معیار بیان کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ عمدہ کلام وہ ہے کہ دوسرے کلام و اشعار کے درمیان اس طرح ممتاز ہو جائے کہ انسانی نفوس کو اپنی طرف متوجہ کر لے۔ اس کی رونق اور چمک اس طرح واضح ہو جیسے موتی کنکروں میں چمکے یا جیسے یاقوت ہار میں[5]

ان کا خیال ہے کہ کلام کو وحشی طرز عبارت و الفاظ سے خالی اور صنعت و تکلف سے مبرا ہونا چاہئے۔ یہاں تک کہ سنتے ہی وہ دل میں گھر کر جائے۔ اس کو اتنا شیریں ہونا چاہئے

---

[1] اعجاز القرآن ص ۲۸ [2] ایضاً ص ۵۸ تا ۶۱ [3] ایضاً ص ۶۲
[4] ایضاً ۶۳ [5] ایضاً ص ۶۴

جیسے آبِ زلال مگر اس کا حال یہ ہو کہ دیکھنے والا یہ سمجھے کہ وہ بھی ایسا آسان کلام کہنے پر قادر ہے لیکن جب کہنا چاہے تو اس کو ایسا محسوس ہو جیسے کہ وہ اس کلام سے اتنی دور ہے جتنے ستارے اس سے دور ہیں[1]

وحشی و مستکرہ کلام تمام ادباء و شعراء کے یہاں موجود ہے حتیٰ کہ امرؤالقیس کے یہاں بھی پایا جاتا ہے[2]

باقلانی کہتے ہیں کہ شعر کو اجزاء کے اعتبار سے مساوی ہونا چاہئے یہ مساوات طول و قصر، ساکن اور حرکت سب میں لازم ہے[3]

باقلانی ابتدائے شعر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شاعری بغیر قصد کے وجود میں آئی جب لوگوں نے یہ نظام دیکھا تو بہت پسند کیا۔ اور انداز پر عمداً شعر کہنے لگے[4] ان کا خیال ہے کہ عربوں کی شاعری ان کی نثر سے زیادہ فصیح ہے[5]

نظم قرآن کے بارے میں باقلانی نے ایک طویل بحث کی ہے۔ جس میں ادبی تنقید کے مظاہر پوری طرح جلوہ گر ہیں۔ اس میں چند وہ قصائد بھی ہیں جن کی عظمت پر عرب ناقدین کا اجماع ہے انھوں نے ان کو لے کر ان کی تحلیل کر کے ان کے عیوب و نقائص کو واضح کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ عمدہ سے عمدہ کلام میں بھی کتنے عیوب موجود ہیں مگر اس کے مقابلہ میں قرآن میں کسی قسم کا کوئی عیب و نقص نہیں پایا جاتا[6]

باقلانی نے امرؤالقیس کے مندرجہ ذیل اشعار پر تنقید کی۔

ففاضت دموع العین منی صبابۃ   علی النحو حتی بل دمعی محملی

۱؎ اعجاز القرآن ص ۶۹   ۲؎ ایضاً ص ۷۰   ۳؎ ایضاً ص ۸۴ – ۸۹ –

۴؎ ایضاً ص ۶۵ – ۹۶   ۵؎ ایضاً ص ۲۳۶

۶؎ ایضاً ص ۲۳۷ تا ۲۴۱

محبت کی وجہ سے سینہ پر آنکھوں سے آنسو بہہ کر آئے حتیٰ کہ میرا محمل بھیگ گیا۔

الارب یومٍ کان منھن صالح — ولا سیما یوم بدارۃ جلجل

بعض دن ان عورتوں کی وجہ سے بڑے پر لطف گذرے خصوصاً جو دن "دارہ جلجل" میں گذرا

اس میں عیب یہ ہے کہ لفظ "منھن" حشو ہے اسی طرح "علی النحر" بھی حشو غیر بلیغ ہے "دمعی محملی" بھی حشو ہے صرف وزن کو برقرار رکھنے کے لئے شاعر کو یہ سب کرنا پڑا ورنہ "محمل بھیگ گیا" کہنا کافی ہے۔ اسی طرح دوسرا شعر بھی عمدہ معانی اور دل کش طرز بیان سے عاری ہے۔[1]

دوران تنقید باقلانی نے بعض اشعار کی تعریف بھی دل کھول کر کی ہے۔ مثلاً یہ شعر:-

قد اغتدی والطیر فی وکناتہا — بمنجرد قید الاوابد ھیکل.....

میں سویرے جب کہ چڑیاں اپنے گھونسلہ میں ہوتی ہیں ایک بڑے اور تیز گھوڑے پر نکلتا ہوں۔

وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں لوگ عمداً ایسے اشعار کہنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دور جاہلیت میں لوگ فطری طور پر ایسے اشعار کہتے تھے جس کی وجہ سے ان میں تکلف کی جھلک ذرا بھی نظر نہیں آتی ہے[2]

اگرچہ باقلانی نے امرؤ القیس کے قصیدہ پر بہت سخت تنقید کی ہے مگر اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ اس دور میں تنقید ترقی یافتہ تھی اور اشعار کی تنقید بڑی ژرف نگاہی سے کی جاتی تھی۔ ناقد الفاظ و معانی سب ہی پر گفتگو کرتا تھا۔ وہ مذکورہ قصیدہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں ناپسندیدہ، وحشی اور سوقی اشعار بھی ہیں متوسط درجہ کے بھی ہیں۔

---

[1] اعجاز القرآن ص ۲۴۹ تا ۲۵۰ [2] ایضاً ص ۲۷۶-۲۷۷

اور چند عمدہ بھی ہیں۔ جس میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ پھر اس طرز کے قصائد دوسرے شعراء کے یہاں بھی مل جاتے ہیں یعنی امرؤالقیس کے قصیدہ کے مثل محاسن دوسروں کے یہاں بھی موجود ہیں[1] اس کے بعد وہ قرآن مجید کی فصاحت وعظمت کا بیان کرتے ہیں۔

اس کے بعد باقلانی بحتری کے قصیدہ پر آتے ہیں جس کا مطلع ہے:۔

اھلا بذلکم الخیال المقبل فعل الذی نھواہ او لم یفعل

مبارک ہو یہ آنے والا خیال جو از خود آ رہا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ "ذلکم الخیال" حشو اور ثقل روح ہے۔ اس مفہوم کا صنوبری کا شعر نقل کر کے باقلانی اس کو زیادہ عمدہ قرار دیتے ہیں۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ حسنِ شعر ایک حرف کی کمی یا زیادتی سے ختم ہو جاتا ہے۔ وہ "فعل الذی تھواہ اولم یفعل"، کو بھی ایک ناپسندیدہ الفاظ اور عبارت قرار دیتے ہیں۔

اس قصیدہ کے ایک شعر کی انھوں نے تعریف کی ہے۔

برق سری فی بطن وجرۃ فاھتدت

وجرہ کے بطن میں بجلی چمکی تو اس کی

بسناہ اعناق الرکاب الضلل .....

روشنی سے ان سواریوں نے جو راہ بھول گئی تھیں راہ پالی

وہ لکھتے ہیں کہ یہ شعر حسن و خوبی کا منبع ہے۔ اس کے باوجود اس شعر پر یہ تنقید کی گئی کہ اس میں "بطن وجرہ" حشو ہے پھر روشنی کی کسی مقام تک تجدید بھی مناسب نہیں۔ بجلی چمکنے سے راہ پانا ایک ایسا تخیل ہے جس میں کوئی جدت نہیں اس سے قبل بھی لوگوں نے اس کیفیت کو بیان کیا ہے[2] یہ باقلانی کی تنقید کا ایک نمونہ تھا جو پیش کیا گیا۔

---

[1] اعجاز القرآن ص ۲۷۷ [2] ایضاً ص ۳۳۵ تا ۳۳۸

ان کے نزدیک تنقید ایک مستقل فن ہے۔ جس طرح اپنے فن کے رازوں سے صراف اور بزاز واقف ہوتا ہے اور وہ دوسروں کو نہیں معلوم ہوتے اس طرح کلام کے حسن و قبح سے ناقد کو پوری واقفیت ہوتی ہے البتہ اس میں اہل نظر کا اختلاف قابل قبول ہو سکتا ہے[۱]

ناقدوں کے ذوق پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ بعض ناقد پرشکوہ کلام پسند کرتے ہیں اور بعض سلیس عبارت کے شائق ہوتے ہیں۔ بعض غامض معنی و غریب لفظ کے دلدادہ ہوتے ہیں بعض صنائع و بدائع پر جان دیتے ہیں۔ بحتری الفاظ کی شیرینی پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا تھا۔ کچھ ناقد مبالغہ کو روحِ شاعری تصور کرتے ہیں اور کچھ صداقت کو حاصلِ شاعری سمجھتے ہیں۔ بعض وحشی کلام کے شائق ہیں جیسا کہ مفضل نے منصور کے لئے اپنی کتاب "المفضلیات" میں وحشی کلام منتخب کیا ہے اس پر اکثر ناقد متفق ہیں کہ درمیانی راہ بہتر ہے چنانچہ جو طریقہ ابو تمام نے حماسہ میں اختیار کیا ہے وہ افضل ہے۔ جو ناقد وحشی اشعار منتخب کرتا ہے تاکہ اس کا علم ظاہر ہو تو وہ کسی مقصد کے لئے تو ٹھیک ہے مگر شعر کی شیرینی و عظمت اسکو حاصل نہیں ہوتی[۲]

ناقد کو ایسا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے کہ کسی شاعر کے چند قصائد کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اسکے دوسرے اشعار کی شناخت آسانی سے کر سکتا ہے[۳] البتہ کبھی دو شاعروں کے درمیان رنگ کی مشابہت کی وجہ سے ناقد پر معاملہ مشتبہ ہو سکتا ہے جیسے بحتری اور ابو تمام کے بعض اشعار خصوصاً وہ اشعار جن میں ابو تمام نے فطری سادگی اختیار کی ہے۔ جو ناقد شعر کی معرفت میں کامل نہ ہو وہ تنقید میں عظمت کا حامل نہیں ہو سکتا[۴] ناقد کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ کون دیوان چور ہے اور کون واقعی صاحب کمال ہے[۵]

---

[۱] اعجاز القرآن ص ۱۷۲ [۲] ایضاً ص ۱۷۲ تا ۱۷۸ [۳] ایضاً ص ۱۰۳

[۴] ایضاً ۱۸۹ [۵] ایضاً ۱۸۵ - ۱۸۶

ناقد ہر شاعر کے رنگ کا شناسا ہوتا ہے اس کو بحتری، ابن رومی، ابو نواس، مسلم، اعشیٰ، امرؤ القیس نابغہ، زہیر، جریر، اخطل، فرزدق اور لبیث کے درمیان فروق خوب معلوم ہیں[1] اسی طرح نثری اسالیب کے امتیازات بھی اس کی نگاہوں میں ہوتے ہیں۔ عبدالحمید کے اسلوب سے لے کر لبید تک کے اسالیب کے فروق کو وہ بطرزِ احسن جانتا ہے[2]

بعض کلام ایسا ہوتا ہے کہ اس میں معانی کم عبارت زیادہ ہوتی ہے۔ بعض میں عبارت کم اور معانی زیادہ پائے جاتے ہیں۔ بعض کلام میں معانی و الفاظ بالکل مناسبت کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ بعض مواقع پر ایک جملہ کافی ہوجاتا ہے۔ اور بعض مواقع پر تفصیل کی ضرورت پیش آتی ہے[3] اس طرز کے جملے کبھی عمدہ ہوسکتے ہیں کبھی مذموم اور کبھی متوسط۔[4]

غزل کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ جب غزل عاشق کی زبان سے کہی جاتی ہے تو بر رونق ہوتی ہے اور جب وہ تکلف کے ساتھ موزوں کی جاتی ہے تو مذموم بن جاتی ہے[5]

کلام نفوسِ انسانی کے اندر پوشیدہ خیالات و آراء کے اظہار کا نام ہے۔ اس لئے ایسے الفاظ کا انتخاب مناسب ہے جو مطلب کو زیادہ واضح کرتے ہوں۔ ان میں غرابت وغیرہ نہ ہو تاکہ ٹھیک سے سمجھ میں آسکیں۔ البتہ عبارت عامی وسوقی نہ ہونی چاہیے[6] فنکار ایک مصور کی مانند ہے جو دوسروں کے لئے اپنے نفس کی تصویریں پیش کرتا ہے[7]

یہ تنقیدی افکار جو باقلانی کی کتاب میں ملتے ہیں وہ چوتھی صدی ہجری میں عربی

---

[1] اعجاز القرآن ص ۱۸۴ [2] ایضاً ص ۱۸۴-۱۸۵ [3] ایضاً ص ۱۸۱

[4] ایضاً ص ۱۸۱ تا ۱۸۲ [5] ایضاً ۱۸۱ [6] ایضاً ۱۷۸

[7] ایضاً ص ۱۸۱

تنقید کے ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس عظیم ناقد نے عربی تنقید میں تقابلی مطالعہ کا آغاز کیا۔ بعد میں قاضی جرجانی نے درحقیقت اسی انداز پر اپنی کتاب الوساطة بین المتنبی وخصومه لکھی جس میں تقابلی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ دوسری اہم تنقیدی خدمت باقلانی نے یہ انجام دی کہ ان کی کتاب نے یونانی اور عرب مکاتب فکر کو ایک دوسرے سے قریب لانے کا کام کیا۔ انھوں نے کسی یکتی تعصب کو دخل نہیں دیا اور یونانی و عربی دونوں تنقیدی مکاتب فکر سے استفادہ کر کے قرآن مجید کی عظمت کو پیش کیا۔

باقلانی کی سب سے بڑی عظمت تو یہ ہے کہ انھوں نے عملی تنقید کو اپنی کتاب میں پیش کیا۔ عملی تنقید کی جاندار مثالوں سے اعجاز القرآن پُر ہے۔ اس طرح درحقیقت باقلانی نے ادبی تنقید کو مختلف حیثیتوں سے آگے بڑھایا اسی بنا پر زغلول سلام نے اپنی کتاب "اثر القرآن فی سطور النقد الادبی" میں ان کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ مگر تعجب ہوتا ہے کہ محمد مندور نے النقد المنہجی میں ان کی عظمت کو نظر انداز کیا ہے حالانکہ چوتھی صدی ہجری کے ناقدوں میں باقلانی کی تنقیدی کاوش ایک منارۂ نور ہے جس سے عرب ناقدوں نے روشنئ فکر و نظر حاصل کی ہے۔